* قدسیہ نثیر
** ڈاکٹر بدر مسعود خان
*** نسیم مائی

جدید سرائیکی شاعری میں روایت کا تصور

Concept of Tradition in Modern Seraiki Poetry

Abstract:

Modern Siraiki poetry is inter connected and interwoven with its classical approaches. The Anecdotes of this poetry is deeply rooted with its land and people. Having individual Geographical identity, people have their own moral, cultural and social norms and values. They have their limited appetencies. Land Lords of this land one so cruel that they remain oppressor for simple, poor and innocent people. Modern Siraiki poets have courage to speak against these cruel people and system of tyranny openly through their writings. Their Land (dharti) is their mother. Their Samaj is paradise for them. Poor people with their young daughter spend their lives like thieves. Paternal duties of wedding of their young (dhis) girls. The natives of this land are true picture of poverty simplicity. They do not have lost for have lust for heaps of wealth. They never try to snatch the bread of the others. They are courageous enough to face cruelties of the Sardars and Landlord openly.

Keywords: *Dharti, Siraiki, oppressor, Appentencies, dhis*

جدید سرائیکی شاعری کی روایت کا سلسلہ بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی تعلیمات کے ساتھ پیوست ہے۔ آج کل کے دور میں جسے ہم سائنسی ترقی کا جدید دور کہتے ہیں اخلاقی

قدریں زوال پذیر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔نفسانفسی ، بے حسی، خودغرضی، تنگ نظری اور کم ظرفی کے علاوہ بے شمار سماجی برائیاں بڑھتی پھیلتی نظر آتی ہیں۔ برداشت کا ظرف زوال پذیری کی طرف گامزن ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے اسلاف اور بزرگوں کی روایت سے منہ پھیر لیا ہے۔

سرائیکی زبان کے صوفی شعراء نے محبت، اخوت، رواداری اور بھائی چارے کا جو درس دیا تھا آج اس کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ بادشاہ اور صوفی میں فرق یہی ہوتا ہے کہ بادشاہ علاقوں، ریاستوں اور ملکوں پر حکومت کرتا ہے جب کہ صوفی کی حکومت لوگوں کے دلوں پر ہوتی ہے۔سرائیکی زبان کے جدید شعراء نے اس بھید کو ڈھونڈ نکالا ہے۔آج کل کے دور میں ایسے ماحول کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔جس میں امن آشتی، اخوت ، انس، پیار ومحبت موجود ہو۔آج کا انسان حرص و ہوس، طمع ، لالچ سے بیزار دکھائی دیتا ہے۔ان کی خواہش ہے کہ سماجی خوشحالی اور دوسروں کی خوشی کی خاطر ایسے طور طریقے اپنائے جائیں جس کی بناء پر سماج مختلف رنگوں کے پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ بن جائے جس کی خوشبو ہر سو بکھری اور ماحول کو معطر کرتی محسوس ہو سکے۔

کسی بھی سماج کی زبان میں یہ طاقت موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کی زندگی کے تمام روپ، عصری وسماجی رویے، شعوری ادراک ، تاریخ ، مذہب، فلسفہ، جغرافیہ، رہن سہن کی تمام حقیقتوں کو سنبھال رکھتی ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری بخوبی سرانجام دیتی رہتی ہے۔ یہ تمام قصے کہانیاں دراصل انسانی تاریخ کا روپ ہیں۔ان جیسے قصوں کا ذکر کرتے ہوئے جدید سرائیکی شاعر ارشاد تونسوی لکھتے ہیں:

تمام سچ اے
تمام سچ وی تاں سارا سچ نئیں
اساں نہ ہوسوں تاں قصے ہوسن
اساڈے قصے اساڈیاں گالھیں
کئی محبتی انہاں کوں سنسن
کئی محبتی انہاں کوں گاسن

اے سارے قصے سلہاڑیے ہوسن
کئی زمانیں کئی کہانیاں دے
رنگ ہوسن انھاں دے رلے
انہیں دے وچ وی اولوک ہوسن
جنہیں کوں ہر کہیں وسار ڈتے
تے ہک ڈیہاڑے اے سارے قصے
سوال بن تے کہیں توں پچھسن
اساں وی سچ ہیں (1)

انسانی زندگی کی تاریخ کے تانے بانے ہزاروں سالوں کی بھاگ دوڑ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ سرائیکی زبان کی جدید شاعری میں یہ تاریخ خوابوں کی تعبیر بن کر اپنا جوبن دکھاتی ہے۔ ان خوابوں میں نئے رشتے ناتے وجود پاتے ہیں۔ عصری خیالات کے ساتھ مضبوط تعلق بنتا ہے۔ شاعری کا پرندہ عصری خیالات کی اس کتاب کو ساتھ لے کر اڑتا ہوا دور تک کا سفر طے کرتا ہے۔

رفعت عباس خوابوں خیالوں اور ماضی کی اس تاریخی کتاب کا حوالہ اپنی شاعری میں کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

کتاب
پر وبھرے انہیں شہریں دی کتاب
گلیاں وچ ہئی طرحاں پڑھی گئی
اساں مذہب وچوں پکھی ہک بنڑیندے ہیں
گھوڑے ہن تاریخ دے جغرافیے دی ایں کاٹھ تے
کم اساڈے آ گئے ہن
پہلی پھیریں مذہب ہے تاریخ ہے جغرافیہ ہے
کم اساڈے آ گیا ہے
۔۔۔۔۔۔۔۔تے روز وی ایں یدھ وج

روز دی ایں واہر وچ اک دے اساں پتر تے
جوتے جوار دا بارود پئے لڈ یندے ہیں
تھوہر دے ایں توپ نال ڈیلھے ہن کر ینیہ دے
کھٹے پٹے کر یندے ہیں (2)

آج کے دور کا انسان بے شک ایک نئے جہاں میں آنکھ کھول کر کھڑا ہے لیکن اس کے اردگرد کا منظر اس کے بزرگوں کی حیاتی سے بہت مختلف دکھائی دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سائنسی دور میں انسانی زندگی ، لوگوں کے رشتے ناتے ، رہن سہن، مزاج اور زندگی گذارنے کے طور طریقے، خوشیاں ، دکھ، بھوک و پیاس کے عذاب نیا روپ دھارے ہوئے ہمارے سامنے آ کھڑے ہیں۔ شاعری انسان کے اندر کی خوبصورتی کا نام ہے۔ آنے والے کل کے خواب اس کا موضوع بنتے ہیں۔ شاعری مستقبل کی خوبصورت تصویروں کو بشارت کی شکل دے کر انسان کے سامنے لے آتی ہے تا کہ آنے والے دنوں کے دکھوں کی تپش اسے آج سے ہی محسوس ہونے لگ جائے۔ آج کی شاعری میں محبوب کا تصور کلاسیکی شاعری سے قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ آج کے محبوب نے جس دور میں آنکھ کھولی ہے وہاں سماجی زندگی کے تانے بانے الجھاؤ کا روپ دھارے نظر آتے ہیں۔ حافظ نصیر الدین خرم اپنے محبوب سے گلہ شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔

میں جیواں گھن گھن تیڈا ناں
توں ٹھاریں ونج تے بئے داہاں
میں اصلوں گنگا ڈاندہاں
چو بھاں توں چو بھاں نہ وسا (3)

دوست کی دوستی کا احساس زندگی کو جینے کا نیا حوصلہ بخشتا ہے۔ جس کی بدولت انسان اپنے اندر طاقت کا متحرک سمندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ زمانے میں جہاں دکھ اور تکالیف بڑھتے جا رہے ہوں ایسے ماحول میں دوست کی دوستی کا احساس مزید بڑھ جاتا ہے اور دوست کی دوستی کو یاد کیا جاتا ہے۔ دوستی نام ہی محبت کا ہے جب دوست اس کو نبھانے میں ناکام ہو رہا ہو تو اس سے گلہ شکوہ تو بنتا ہی ہے۔ اسی طرح کا ایک شکوہ غلام حیدر خان یتیم جتوئی اپنے دوست سے کرتے نظر آتے ہیں۔

یاری نہ لاونی تھئی، لوکی کھلاونی تھئی
رت ساونی گذر گئی، ہک ڈینہ نہ ساونی تھئی
ساہ جھن تے جھات پاواں ہولے ہولے الاواں
ڈیکھاں تاں چوری چوری جندڑی بچاونی تھئی
قاصد روانہ تھی گے ونج تے دیوانہ تھئی گئے
ولدی نہ ہاں تے ہونہہ ہے
اے رت بجھاونی تھئی (4)

روایت کے اس سفر میں شعراء نے اپنی تخلیقات میں قومیت کو اجاگر کیا ہے۔ ہماری شناخت مٹی کا بت نہیں ہے، گلے میں پڑی ہوئی سانسوں کی جھانجھر ہمیں منزل تک نہیں لے جائے گی۔ جینے کے لیے اپنی نئی اور جداگانہ شناخت ہماری ضرورت ہے اگر ایسا نہ ہو سکا تو وقت ہمارا ساتھ نہیں دے سکے گا اور ہماری شناخت کو پیروں تلے روند دیا جائے گا۔ دھرتی کے لوگ گذشتہ کئی دہائیوں سے تکالیف اور مصائب کا شکار ہوتے چلے آرہے ہیں۔ دکھوں اور تکلیفوں نے زندگی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔غریب لوگوں کی آس اور امید زندگی کے مصائب میں سانس لے رہی ہے۔غریبوں کی غربت زندگی کا روگ بن جاتی ہے۔ ایسے دکھوں کا بیانیہ جدید سرائیکی شعراء نے اپنی شاعری میں بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔اگر جوان بیٹی گھر میں بن بیاہی بیٹھی ہوتو ماں باپ کی سب سے بڑی خواہش اس کے ہاتھ پیلے کرنا ہوتی ہے۔ جوان بیٹی جب ماں باپ کی آنکھوں میں دیکھتی ہے تو دکھ اور غموں کا ایک سمندر تلاطم خیز موجوں کے ساتھ موجزن ہوتا ہے۔ ایسی حالت دیکھ کر وہ اپنی قسمت کا رونا روتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کا حصہ ہوتی ہے جہاں ہر طرف طعنے سنائی دیتے ہیں۔لوگوں کو اپنا گریباں نظر نہیں آتا یا پھر اس کے اندر نظر ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ دوسرا شخص کیسے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ اس کی زندگی عذابوں اور دکھوں میں کس قدر گھری ہوئی ہے۔ ایسی ہی ایک نوجوان لڑکی کے نوحے کو یتیم جتوئی نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے:

میں مروندی یا میں کنواری نہ ہوندی
وٹاواں پوشاکاں مقالیں دا زوراے

کراں سیندھ سرمہ تاں آکھن اے چوراے
میری بیڑی بڈ گئی نہ گڈی نہ ڈوراے
نہ طوفان ہوندا اندھاری نہ ہوندی
جوانی میکوں میں جوانی کوں کھا گئی
کیتی پیو بھرا میڈے سر تے آ گئی
میڈی عیش دنیا دی بوٹی کما گئی
ملامت ، ندامت ، خواری نہ ہوندی
پٹیندی ہاں منہ تے توڑے ہتھ ملوک ہن
میڈے گل حیا دی جے گاری نہ ہوندی
میڈے وس جے ہوندا ایں جگ تے نہ آندی
نہ پیو کوئی ہنڑ یندی نہ ماء پیٹ پیندی
جے جیندی تاں قاتل زہر گھول کھمدی
ہک ہک موت دی انتظاری نہ ہوندی
میں مروینڈی یا میں کنواری نہ ہوندی (5)

ماں باپ کی اولاد کے ساتھ محبت بے لوث ہوتی ہے۔ اولاد ساری پیاری لگتی ہے البتہ بیٹیوں کے ساتھ خاص لگاؤ اور محبت اس سرائیکی وسیب کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ سرائیکی وسیب میں بیٹیوں سے خاص محبت اور ان کے کھلونوں سے پیار فطری امر ہے۔ بیٹیاں جب چھوٹی ہوتی ہیں تو گڑیوں کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ گڈے گڈی کی شادی کی جاتی ہے۔ ماں باپ ان گڑیوں میں اپنی بیٹیوں کو تلاش کرتے ہیں اور مستقبل کے تانے بانے بنتے ہیں۔ کبھی کبھی انہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ گڑیا بھی ان کی طرح بہت اداس اور دکھی ہیں۔ محمد سلیم خان نیازی نے اس منظر نامے کو یوں پیش کیا ہے:

میڈی دھی دیاں گڈیاں میکوں ڈاڈھیاں پیاریاں لگدن
لیراں نال بنڑیاں ہوئیاں اپنیاں ساریاں لگدن
میڈے وانگن ڈکھی ہن ایہ ول وی چپ رہ ویندن

میکوں تاں اے میں توں زیادہ ڈکھ دیاں ساریاں لگدن
میکوں ٹک ٹک ڈیہد یاں راہندن گالھ کریندیاں کینی
لولیاں ڈینداں بہوں کھلوینداں ولا وی مونجھیاں لگدن
ہر گڈی وچ میکوں اپنی دھی دا عکس نظر دے
میکوں میڈی دھی وانگوں گڈیاں ساریاں لگدن (6)

غربت سرائیکی سماج کا ایک ایسا المیہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرتی سماج میں اونچ نیچ ایسے منظر نامے تخلیق کرتی دیکھائی دیتی ہے۔ جہاں امیروں، تمنداروں، وڈیروں، سرداروں کی الگ دنیا ہوتی ہے جس میں غریبوں کے لیے دکھوں اور تکلیفوں سے مزین الگ جہان ہوتا ہے۔غربت کے مارے ان لوگوں کے جذبات اور احساسات کو یہ امیر لوگ اپنے قدموں تلے روند دیتے ہیں۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ بھی جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان کی بھی خواہش اور خواب ہیں۔ یہی خواب وہ اپنی آنکھوں میں بسائے آنکھیں بند کر جاتے ہیں۔ معاشرتی اونچ نیچ کا ایسا بیانیہ سید حسن رضا گردیزی کی شاعری کی شناخت بنتا ہے۔ امیروں کے گھر بیوہ نوکرانی کے ساتھ کیا بنتی ہے:

ہک بیوہ نوکر دا بچہ — بھولا بھالا ترائے ورھیاں دا
منہ تے مٹیاں ننگ دھڑنگا — سر توں ننگا پیروں ننگا
جمدیوں روندا جمدیوں ڈکھا — چھوٹی عمراں پیار دا بکھا
گھر وچ جے ماء جھاڑو پھیرے — اے وی پچھوں پاوے پھیرے
ماء نلکے تے کپڑے دھووے — اے وی پچھوں آن کھڑووے
مامتا دا پر چھانواں گولے — دھپ وچ ٹھڈیاں چھاواں گولے
اچا چیت ہک بجلی ڈھاوے — بیگم گھر کوں سر تے چاوے
چھوہر تیکوں شرم نی آندی — ان ڈھلکاندی ان ڈھلکاندی
رکھ گھنسوں کئی بئے کوں نوکر — چھوڑ ڈے نوکری بجھ ونج گھر کوں
بی بی میڈا کوئی گھر کائنی — خیر اتھاں وی لنگر کائنی
ایں منزل تے مامتا ہارے — ماء بچڑے کوں چاٹاں مارے

جیڑھے ویلے مار کھلووے ماء وی رووے بال وی رووے (7)

ایسی شاعری کو انقلابی شاعری بھی کہا جا سکتا ہے۔ انسان نے بے شک جتنی ترقی کر لی ہے۔ مشینی دور نے جہاں اسے سست اور کاہل بنا دیا ہے وہاں دوسری طرف اس کا دل بھی جذبات اور احساسات سے عاری ایک مشین بن گیا ہے۔ جب انسان کے دل سے احساس نام کی چیز نکل جاتی ہے تو وہ انسان نہیں رہتا بلکہ ایک جانور اور حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ احساس ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو بلندی اور ارفعیت عطا کرتی ہے۔ مردہ دل ہمدری سے خالی رہ جاتا ہے۔ جھوٹی اور مکار دنیا کے اس ظالمانہ اور نا انصافی پر مبنی نظام کو بدلنے کی خواہش محروم اور محکوم طبقے کے لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگتی ہے۔ سید حسن رضا گردیزی اس خواہش کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک ایسا مصور ہے جس نے شاعری میں تصویریں بنائی ہیں۔

میں آہداہاں چیٹے بدلومیکوں کیا جتھ وس آئے ہو
لیکن یاد رکھوا ے بدلو اپنیں طور طریقے بدلو
میں انسان ہاں طاقت والا، عزت والا، حشمت والا
میں افلاک دے تارے تروڑیے، میں طوفاناں دے منہ موڑیے
کوڑے نال جھگڑ دا آیاں، میں صدیاں تو لڑدا آیاں
ہر جار حصے رسدی وسو، کہیں مظلوم دا حق نہ کھسو
اپنیں طور طریقے بدلو، چیٹے بدلو (8)

جدید سرائیکی شاعری میں پیار، محبت انس ، مزاحمت، سماجی و عصری شعور ، دھرتی کے ساتھ مضبوط رشتہ اور وسیبی ثقافت کا عنصر نمایاں ہے۔ عاشق بزدار کی شاعری میں جہاں مزاحمت نظر آتی ہے وہاں سماجی تہذیب و ثقافت اور انسانی محبت کی مٹھاس اور جذبوں کی سچائی نمایاں ہے۔

بابل ، تیڈا ویڑھا وسے
امڑی دی جھولی دانگوں، ساکوں یاد اے بابل
ساڈا ہتھ نپ آپ کھیڈ یندا ہانویں، اپنے صحن دے اگواڑ ساکوں پوں پوں
ٹرن سکھیندا ہانویں جیڑھلے اساں ٹرن سکھیوں

تاڑی مار اڈایوں ساکوں ہن تاں بابل

اوپرے گھر دیاں کندھاں ساڈے جاہ ٹکانے

ٹیڈے ویڑھے لگدن بابل ساڈے کونجیں والے پھیرے

اساں تیئں توں کجھ نئیں منگدیاں، نہ ساڈی حُج حیل ہے کاٹی

بابل تیں تائیں بس ہکاز اری، اپنے صحن اگواڑ توں ساڈے پیر نہ میسیں (9)

جو لوگ اس دھرتی کا بھاگ اور سہاگ تھے اپنی مٹی کا بخت اور قسمت تھے وقت نے انہیں قدموں تلے روند دیا ہے۔ نام نشان رکھنے والے لوگ بے نام ہو کر زندگی کی سانس پوری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگوں سے شناخت چھین لی گئی ہے۔ اپنی شناخت کو ڈھونڈتے ہوئے یہ لوگ بے بسی اور بے سروسامانی کا نمونہ بن گئے ہیں۔ عاشق بزدار نے اپنی شاعری میں ایسے بے نام لوگوں کو ان کی شناخت سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔

ساڈی کوئی اوقات نہ پچھو

حسرت تے ارمان نہ پھولو

اساں ایں دھرتی دے جائے

کل تانی تاں سب کجھ ہاسے

اج تاں بن گیئوں لریئے ماچھی مہیے موہانے

اساں بدھیلو، لایاں لانے کپ تے، کھاریاں ٹوکرے وَنڈوں

اساں چوڑھے، جلماں رَمیاں لاون والے

اساں اوڈتے بھیل سڈیجوں

ساڈیاں دھیاں، دھیریں، بھینیں، سڑکیں پتھر ڈھوون،

نگری نگری پنن والے پکھی واس فقیر سڈیجوں

اساں کنگر، دائے، کوٹانے، وہیر وہاون والے، اساں رچھ نچاون والے

اساں موچی تہاڈیاں جتیاں سیون والے، اساں پولی تہاڈی بزم دی رونق سانگے

اساڈے پاگل پن دیاں ہن مشہور کہانیاں، اساں کمی، ڈوم، مراثی

ساڈیاں جایاں سہرے گاون، گھر گھر وچ خوشیاں ڈے آون
وَل وی ڈوہ دیاں گنڈھڑیاں چاون، بکھ تے ڈکھ دا انت نہ پاون
ساڈی دھرتی دے سینے تے، رام کرے ہن مرلی وجے (10)

سرائیکی وسیب کا اپنا مخصوص جغرافیہ ہے۔ اپنا جدا گانہ جغرافیہ اورانوکھا ادب ہے۔قوم پرست شاعر اپنی دھرتی کے ساتھ محبت کا اظہار کرتا ہے یہاں وہ اپنے ردعمل کا بھرپور اظہار بھی کرتا ہے۔ شاعر کی یہ ارداس اور خواہش دھرتی کے ساتھ سچے عشق کا ثبوت ہیں۔صبر، قناعت پسندی، صبر وشکر، رکھی سکھی کھانے والے اس دھرتی کے لوگ بھوکے تو مر سکتے ہیں لیکن کسی کے آگے دست سوال نہیں کر سکتے۔ اپنا حق کسی کو چھیننے نہیں دیتے اور کسی کے مال پر نظر نہیں رکھتے۔ سرائیکی شاعری کی روایت کا ایک بڑا علمدار سفیر لشاری ہے جو بیان کرتے ہیں۔

اساں بے فیض ساون توں کوئی سوغات نئیں منگدے
جیڑھی وا چھڑ پئے ایرے اوجھی برسات نئیں منگدے
توں اتنا کرجو اساکوں اپنے قد تونڑیں رسائی ڈے
خداوند اساں بئے تیئں کنوں درجات نئیں منگدے
اساڈے خواب تعبیراں دی سک اچ کے تیئں ہن
اساں سکھ دی سحر منگدوں ڈکھاں دی رات نئیں منگدے
اساکوں توں مظفر خان تے احمد خان کھرل سمجھیں
ہنیں ازما اساں سوچن کیتے لمحات نئیں منگدے
اساں ایں دور دے منصور ہیں سولی تے چڑھ ویسوں
سفیر اے حق اے حق منگدوں اساں خیرات نئیں منگدے (11)

عاجزی، انکساری اور نیاز مندی اس وسیب کی سماجی اور تہذیبی شناخت ہے۔ یہ رمز ہمارے خون میں شامل ہے۔غرور، تکبر، فخر وغرو سے دور رہنے والے لوگوں کا اپنا الگ جہان ہوتا ہے۔ اس وسیب میں رہنے والے تمام لوگوں کی سوچ بے شک ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اس وسیب کے زمیندار اور وڈیرے اپنے آپ کو اعلیٰ درجے کی مخلوق سمجھتے ہیں اور باقی غریب لوگوں کو کمتر اور حقیر جانتے ہیں۔ ان غریب لوگوں کی زندگی کا پل پل اذیت میں گذرتا ہے۔ ان تمام مصائب کے باوجود ان

کے لبوں پر مسکراہٹ موجود رہتی ہے چاہے ان کے دل زخموں سے چور چور ہوں۔ یہی روایت جدید سرائیکی شاعری کا سماجی وعصری منظر نامہ بنتی ہے۔عزیز شاہد بیان کرتے ہیں۔

اساں پیت پریت دے پاندھڑی، اساڈے مونڈھیں مونجھ ملہار
اساں اندر نئیں مونجھڑے، اساڈے لب تے کھل مسکار
ساڈے گذرن پل پل اوکھڑے، سیر سو سو وہم و چار
اساڈی سک دے اپنے سیدھڑے، اساں اپنی مستی تار
اساں وسدی من دے واسڑی، ساڈے رشتے پار اروار
اساں کمی در دے باہنڑیں، اساں فصلیں دے لئی ہار
اساں تھل دامان دے جھومری، اساڈے نال ء وقت ونگار(12)

جدید سرائیکی شاعری تخلیق اور فکری سطح پر انوکھا تجربہ دکھائی دیتی ہے، علامتوں اور استعاروں کے گھیر سے اس کو دوبارہ کھولا گیا ہے۔ کمی، کسبی، غریب اور مزدور کی تصویر کشی بہت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ یہی لوگ دھرتی کا بھاگ سہاگ اور رونق ہیں۔ جدید سرائیکی شاعری کی عصری اور سماجی تاریخی روایت زندگی کے نئے در وا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جدید سرائیکی شعراء نے اپنے بیانیے کے لئے مختلف رنگوں کے الفاظ کو منتخب کیا ہے اور ان رنگوں سے خوبصورت تصویریں تراش کی ہیں۔ سرائیکی شعراء نے کلاسیکی روایت کے ساتھ بھی اپنا ناتا برقرار رکھا ہے اور سماجی عصری شعور کو سامنے رکھتے ہوئے جدت کو اپنی شاعری کا حصہ بھی بنایا ہے۔

References:

* Lecturer, Department of Seraiki, Bagdad Aljadeed Campus, Islamia University Bahawalpur

** Assistant Professor, Department of Seraiki, Islamia University Bahawalpur

*** PhD Research Scholar, Department of Seraiki, Islamia University Bahawalpur

1- I rshad Tonsovi- Nadi Naan Sanjook, (Multan: Seraiki area Study Center, 2006)89,90

2- Riffat Abbas- Probhary Hik Shehar Vichon(Multan: bekon box, 2002) 48,49

3- Khurram Bahawalpuri- Khayaban-e-Khurram (Bahawalpur Seraiki Adbi Majlis, 1986)27.

4- Ghulam Haider Khan Yateem Jatoi- Dure Yateem (Multan: Jhok Publishers 2014)57.

5- Yateem Jatoi- Kalam Mashmoola, Desi Sukhanwar (D.G Khan: Bazm-e- Akram, 2004)26,27.

6- Muhammad Saleem Khan Niazi- Muhabat Reet hy Sadi (Ahmadpur Shariqia: Bakhtawar Publications, 2009)102.

7- Hassan Raza Gardezi- Dhaby Dhureh (Multan: Bazm-e-Sqafat, 1979) 45,47.

8- As Above, P-27,28

9- Ashiq Buzdar- Qaidi Takhat Lahore dy (Multan: Jhok Publishers, 2014)75,76

10- As Above, P-102,103

11- Safeer Lashari- Asan Kherat nhi Mangdy (Ahmadpur Shariqia: Safeer Seraiki Adbi Sangat, 2001)43,44.

12- Aziz Shahib- Mann Darya Ty (D.G Khan: Fareed Seraiki Adbi Sangat, 1993)141.